Research Journal
Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 05، شمارہ نمبر 01، جون-2024

ڈاکٹر اقبال آفاقی اور اُردو ناول کا تنقیدی منظر نامہ

1. رباب تبسم، اسکالر پی ایچ ڈی (اُردو) الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔
2. ڈاکٹر مظفر حسین، ایسو سی ایٹ پروفیسر (اُردو) الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد۔
3۔ڈاکٹر سعدیہ طاہر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی اسلام آباد

1. Rubab Tabassum, PhD (Urdu) Scholar Alhamd Islamic University, Islamabad
2. Dr. Muzaffar Hussain, Associate Professor (Urdu) Alhamd Islamic University Islamabad
3. **Dr. Sadia Tahir Asst. Prof. dept. of Urdu, Federal Urdu University Islamabad**

ISSN
eISSN: 2789-6331
pISSN: 2789-4169

Copyright: © 2024 by the authors. This is an article open access distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT
Dr. Muhammad Iqbal Afaqi is a prominent critic. He has written critical essays on all genre of the Urdu literature. His book about the criticism of Urdu Novels is very important. In this article, all important essays on different novelists have been discussed and analyzed. The Students and Scholars of Urdu Novel and its criticism can seek light from this article.

Keywords: Urdu Novel, Criticism, Urdu Literature, Dr. Afaqi

ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تنقید کی ایک اہم جہت فکشن کی تنقید ہے۔ فکشن کی تنقید کے ضمن میں آپ نے اُردو افسانے اور اہم افسانہ نگاروں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یہ سلسلہ آپ کی ابتدائی تصنیف "معنی کے پھیلتے آفاق" سے شروع ہو گیا تھا۔

افسانوی ادب کی تنقید کے تناظر میں ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تصنیف "اُردو ناول: نئی توجیہات و تعبیرات" کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ اُردو ناول کے حوالے سے ڈاکٹر اقبال آفاقی کی رائے ہے:

"ناول کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ناول لکھا گیا اور شروع ہوا تو بنیادی طور پر یہ جدیدیت کی چیز ہے۔ یعنی روشن خیالی کے ایجنڈے کے تحت لکھا

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 05، شمارہ نمبر 01، جون-2024

گیا۔ اس میں نہ کوئی فرشتہ ہے، نہ شیطان ہے، سارے کے سارے انسان ہیں اور انسان نے انسان کو دیکھا ہے۔ اس نے فرشتوں کو نہیں دیکھا۔ اس نے انسان کو دیکھا ہے، اس کے کلچر کو دیکھا ہے، اس کے تہذیبی اور نفسیاتی رویوں کو دیکھا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے نہ اس میں بائبل ہے، نہ قرآن ہے۔ یہ جو "اُردو ناول: نئی توجیہات" کا تجزیہ کیا ہے وہ اسی کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے"۔(1)

ڈاکٹر اقبال آفاقی نے جس طرح اردو افسانے کی روایت اور اس کی فکریات پر جدید مباحث اُٹھائے ہیں بالکل اسی طرح انھوں نے ناول کی روایت کا بھی مبسوط مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس اہم کتاب کا نام "اردو ناول: نئی توجیہات و تعبیرات" ہے جسے صریر پبلیکیشنز لاہور نے 2020ء میں خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس میں کل نو (9) مضامین ہیں جن میں چار مضامین کو ہم ناول کی کلاسیکی روایت کا حصہ قرار دے سکتے ہیں، جن میں "امراؤ جان ادا"، "علی پور کا ایلی"، "اداس نسلیں" اور "بستی" شامل ہیں جب کہ پانچ ناول جدید رجحانات کے عکاس ہیں۔ ان میں "راجہ گدھ"، "بہاؤ"، "غلام باغ"، "ناتمام" اور "جاگے ہیں خواب میں" جیسے نمائندہ ناولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ جس ترتیب سے ڈاکٹر اقبال آفاقی نے کتاب میں مباحث اٹھائے ہیں اسی ترتیب میں ان کا بیان مقالہ ہذا میں پیش کیا جائے۔

پہلا ناول "امراؤ جان ادا"، لکھنو کی مونالیزا کا پورٹریٹ ہے۔ اس ناول کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر اقبال آفاقی نے خود کلامی کے انداز میں کچھ اہم سولات کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی روشنی میں "امراؤ جان ادا" کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ ایک طوائف کی زندگی پر لکھا گیا یہ ناول سو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک متعلق اور باوثوق کیوں ہے؟ زمینی اور زمانی بُعد کے باوصف غیر متعلق کیوں نہیں ہوا؟ اس میں کون سی کشش اور تابندگی ہے جو لوگوں کو ابھی تک اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے ہے؟ کیا اس کی بڑی وجہ ناول کے اندر موجود کوٹھے کی فضا ہے، جو ہوا و ہوس کی تسکین کا وافر سامان مہیا کرتی ہے؟ کیا اس ناول میں نامختتم دلچسپی کا سبب زوال پذیر (Decadent) لکھنؤ کا وہ ثقافتی منظر نامہ ہے جس میں طوائف کے کوٹھے کو شہری تہذیب میں مرکزیت حاصل ہو چکی تھی۔ کیا یہ ناول محض کسی بدنصیب اور دکھی بیسوا کی داستان حیات ہے جس پر زندگی غلاظت کے ڈھیر کی صورت میں نازل ہوئی تھی اور زندگی کا ہر لمحہ جس کے نتیجے میں روح کی تذلیل پر منتج ہو رہا تھا۔ کیا یہ ناول نو آبادیاتی طرزِ زیست کے کسی خاص مرحلے کا آئینہ دار ہے جس کی چمک دمک اور ترغیبی خصوصیات ناقابل مزاحمت ہیں۔ کیا یہ ناول اصلاح پسندی کی دعوت کا شاخسانہ ہے جو سرسید احمد خان اور اُن کے رفقا کا خاص ادبی پیشہ تھا۔

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں "امراؤ جان ادا" پر ویسے تو کافی کچھ لکھا گیا ہے لیکن آج تک اس نوعیت کے سوالات شاید ہی کسی نقاد نے اٹھائے ہوں۔ اس ناول پر سامنے آنے والے اکثر تنقیدی تنقیدی محاکمے اور مطالعات بالعموم اس عہد کی سطحی معاشرت کو بیان کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر اقبال آفاقی نے روایتی طرز تنقید سے بچتے ہوئے اس ناول اور اس سے متعلقہ سماجیات کے تناظر میں اترنے کی کوشش کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ دو نئے تنقیدی مقدمات قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ناول میں عصری شعور کی کار فرمائی کو دریافت کرنا اہم تنقیدی کارنامہ ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے:

"عالمی زبانوں کی طرح اُردو میں بھی ناول ایسی واحد صنف نثر کے طور پر سامنے آتا ہے جو عصر حاضر کی نفسیاتی اور سماجی صوتِ حال کو اس کی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عہد کے سماجی رویوں کے تفصیلی مطالعے اور تجزیے کے لیے اس عہد میں لکھے گئے ناولوں کا مطالعہ مطلوبہ نتائج کے حصول میں زیادہ مددگار ہو سکتا ہے"۔(2)

ڈاکٹر اقبال آفاقی تنقید کی اس عمومی روش کی بھی مذمت کرتے ہیں جسے اُنھوں نے "غلامانہ تنقید" یا "غیر تنقیدی روش" کا نام دیا ہے۔ "امراؤ جان ادا" کے باطن سے یہ نکتہ بھی انھی کا دریافت کردہ ہے کہ مرزا ہادی رسوا اپنی اہم علمی اور سائنسی سرگرمیوں میں اس قدر منہمک رہے کہ سماجیات کی اصلاح یا ادبی مقصدیت کی جانب ان کا ذہن متوجہ نہیں ہو سکا یا پھر وہ ادب کو خالص ادب کے حوالے سے ہی دیکھنے پرکھنے کے قائل تھے جس میں کسی قسم کے آدرش یا سماجی خدمت کا عنصر شامل نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اس ناول کے مرکزی خیال کو بہت سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ ناول نگار نے اس ناول میں لکھنوی معاشرت کے ممکنہ رنگ بکھیر دیے ہیں جن میں لکھنوی تصور اخلاق، سماجی محبت، جذباتی پہلو اور حسن و عشق کے معیارات شامل ہیں۔ ناول کا ایک اہم کردار امیرن ہے جو بظاہر طوائف ہے لیکن انسان دوستی کے تمام عناصر اس میں موجود ہیں۔ یہ کردار قدرے شخصی تضادات کا بھی شکار ہے جسے بغیر کسی اضافی تحسین کے قلم سنبھال کر سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ایک زندہ انسان کا کردار ہے جس میں کسی مافوق عنصر کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔

اسی طرح امراؤ جان ادا کو بھی کامل انسانی روپ کا درشن کہنا زیادہ مناسب ہے، یعنی "ایک قادرالکلام شاعرہ، مغنیہ، رقاصہ، مذہبی سکالر، مرثیہ خواں اور روشن ضمیر" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسوآ نے اس کردار کو جنس کی علامت نہیں بننے دیا۔ اس ناول سے حاصل شدہ نتائج کو ڈاکٹر اقبال آفاقی نے ان نکات کی صورت میں پیش کیا ہے۔

اس ناول کا مقصد انسانی توقیر کی بحالی ہے۔ اس کا اہم سبق یہ ہے کہ کسی ایک انسان کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہے۔ تقدیر / سماج کے فیصلوں کے خلاف بغاوت کرنا انسان کا بنیادی حق ہے۔ ماحول خواہ کتنا ہی جابر اور مغلظ کیوں نہ ہو توماروثی صفات کو ملیامیٹ نہیں کیا جاسکتا۔ کوّے کے انڈے سے کوّا اور راج ہنس کے انڈے سے راج ہنس ہی پیدا ہوتا ہے۔ رسوا کا یہ ناول ڈاکٹر واٹسن کی کرداری نفسیات (Behaviourism) کے استرداد کی بہترین مثال ہے۔ تانیثیت کا فلسفہ جو عورت کی توقیر کا پرچار کرتا ہے، گزشتہ چالیس پچاس سال پہلے کی ایجاد ہے جب کہ ہمارے مرزا ہادی رسوا نے تانیثیت کی بنیاد امراؤجان ادا لکھ کر سوا سو سال پہلے رکھ دی تھی۔

ان نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اگر "امراؤجان ادا" کا از سر نو مطالعہ کیا جائے تو ایک نیا جہان معنی کا انکشاف قاری پر ہوتا چلا جائے گا۔

دوسرا ناول علی پور کا ایلی، وجودی بحران میں لکھا ہوا ناول ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تنقید میں عموماً قطعیت کا عنصر خاصا حاوی ہوتا ہے۔ وہ کسی لگی لپٹی کے بغیر سیدھی اور کھری بات کرنے کے عادی ہیں۔ یہ ان کی فلسفیانہ تربیت اور وسعت مطالعہ کی دین ہے۔ وہ ادب کے تمام معاملات میں دلیل اور ادبی اُصولوں کو مد نظر رکھنے کے عادی ہیں۔ اگرچہ ڈاکٹر آفاقی کو اس سرگزشت نما ناول یا ناول نما سرگزشت کی طوالت، غیر ضروری کردار، مکالموں کی زیادتی اور پلاٹ کی ترتیب و تہذیب پر بھی اعتراضات کرتے ہیں لیکن وہ ممتاز مفتی کے اُسلوب، اظہاری قوت، نفسیاتی بصیرت اور واقعہ نگاری کے معترف بھی ہیں۔ وہ محض ایک سطر میں اس ناول کا مرکزی خیال بھی بیان کرتے ہیں کہ اس میں "باپ کی جنسی پرورش سے نبرد آزما بیٹے کی کہانی ہے"۔ تاہم ایسا نہیں کہ وہ اس ناول کی بیان کردہ خامیوں کے بعد اسے مکمل رد کر دیتے ہیں بلکہ وہ ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس ناول میں نئے نئے پہلو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لینا لازمی ہے کہ وہ اس ناول پر مزید کون کون سے اعتراضات اٹھاتے ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> "میرے خیال میں ناول میں کوئی ہیرو ہے نہ کوئی ہیروئن۔ کوتاہ قد کرداروں کا ایک اژدہام ہے۔ ڈھیروں نام سامنے آتے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ پورا آصفی محلہ اور اس کی بیوست گھسی بیٹھی ہے بلکہ ارد گرد اور دور دراز کے متعلقہ اور غیر متعلقہ لوگ حسب توفیق شامل ہیں، عموماً کسی جواز کے بغیر۔ یہ سب ناول کے اسٹیج پر اُبھرتے ہیں اور کوئی بہت بڑا تاثر پیدا کیے بغیر پسپا ہو جاتے ہیں۔ کہانی کو مجموعی طور پر بڑھاوا دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ تاہم ممتاز مفتی کو اس سوال سے کوئی غرض نہیں کہ کہانی آگے بڑھتی ہے یا نہیں۔ کردار نگاری سے لگاؤ ان کی کمزوری ہے۔ وہ پلاٹ کی ضروریات کو بالائے طاق رکھ کر ہر ایرے غیرے کا

خاکہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں ناول لاتعداد خاکوں اور طرح طرح کے موضوعات کی ایک زنبیل بن جاتی ہے"۔(3)

یہ معمولی اعتراضات نہیں ہیں ان کی جگہ اگر کوئی اور ناقد ہوتا تو وہ اس ناول کو شروع سے آخر تک رد کر دیتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال آفاقی اس نفی میں سے اثبات کے ایسے ایسے نادر پہلو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو بالعموم نقادوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔

اس ناول میں وجودی سچائیوں کو مزید وضاحت سے بیان کرتے ہوئے انھیں "وجودی آزادی"، "سیاسی آزادی" اور "روحانی تجربے" کے ساتھ آمیز کر کے بھی دیکھا گیا ہے۔ وجود کو معنی دینے کے لیے ہر ممکن پابندی یا جبر کو توڑنا پڑتا ہے۔ زندگی کو کسی واضح ڈگر پر رکھنے اور سمت معنی دینے کے لیے بھی انتخاب کی آزادی حاصل کی جاتی ہے۔ اردو میں اس نوعیت کے تنقیدی مطالعات کم کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اگلا ناول اداس نسلیں کا مرکزی کردار نعیم، معنیات کے نئے تناظر میں ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اس ناول کے مرکزی کردار (نعیم) پر بات کرنے سے پہلے "آگ کا دریا" اور "اداس نسلیں" کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ کیوں کہ عموماً ان ناولوں کی تقسیم میں موجود مماثلت کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے بعد ناول کی مجموعی فضا پر اعلیٰ تنقیدی تجزیات سامنے لائے گئے جن کی روشنی میں نہ صرف ناول کے تمام اہم پہلوؤں کی وضاحت ہو گئی بلکہ اس کے مرکزی کردار نعیم کی بہتر تفہیم کا سیاق وسباق بھی منکشف ہو جاتا ہے۔ عینی آپا سے تقابل کے بعد جو نتائج سامنے لائے گئے ان کا خلاصہ یہ ہے:

> "عبد اللہ حسین کے ناول میں کہانی، پلاٹ اور کردار کسی مہابیانیے یا کسی ہمہ گیر صداقت کے طرف بردار نہیں۔ وہ کسی نظریے، نسل یا تہذیب کی برتری کے سحر میں ڈوب کر نہیں لکھتا اور نہ ہی کسی خاص خطہ زمین یا نسل کی قومی تاریخ کی تحلیل کرتا ہے۔ وہ تہذیبی ایلیوژن اور تاریخی تصوریت کا خوگر نہیں۔ اس کے یہاں کہانی اور پلاٹ کسی مابعد الطبیعیاتی جواز کی مرکزیت کے مرہون منت ہیں۔ وہ مرکزیت پسند نہیں مرکز گریز ہے۔ اس کا موضوع جاگیر دارانہ اشرافیائی اقدار اور فلسفیانہ انسانیت کے کائناتی مسائل نہیں۔ اس کا مرکز نگاہ عام لوگوں کا طرز حیات ہے۔ کہانی بنتے ہوئے اس نے اساطیری علامتوں کا سہارا لیا ہے نہ ہی الہیاتی (Logocentric) تصورات کے فن میں کہکشاں سجائی ہے"۔(4)

اس میں عبد اللہ حسین کا مکمل تصور حیات سامنے آ جاتا ہے جس میں اُن کی اس ترجیہات اور تصور فن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ہمارے ناول نگاروں کے فن میں جن عناصر کی بہتات نظر آتی ہے، ایسا کوئی عنصر عبد اللہ حسین کے ہاں نہیں ملتا۔

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 05، شمارہ نمبر 01، جون-2024

کوئی خاص آدرش، کوئی ترقی پسندانہ نظریہ اور کسی قسم کی کوئی ادبی تھیوری اس ناول کی چار دیواری میں نظر نہیں آتی۔ عینی آپا کی طرح اشرافیہ کے رہن سہن سے بھی ان کی دل چسپی ظاہر نہیں ہوتی۔ البتہ زندگی کے عمومی مشاہدات اور تجربات کا بیانیہ ان کے ہاں خاصا متنوع اور مضبوط نظر آتا ہے۔

کسی ناول کا اتنا ہمہ گیر تناظر سامنے ہو تو پھر اس کے کسی بھی مرکزی یا ثانوی کردار کے بارے میں رائے قائم کرنا قدرے آسان ہو جاتا ہے کیوں کہ ہر کردار اپنے ماحول اور ثقافتی جبر کا زائیدہ ہوتا ہے۔ نعیم کا کردار بھی اسی جبر سے پھوٹتا ہے جہاں وہ سماج کے مختلف طبقوں کو غور سے دیکھتا ہے انسانی حقوق کی پامالی بھی اس کے روزمرہ مشاہدات کا حصّہ ہے۔ نعیم کا کردار گاؤں کے باقی کرداروں سے اس حوالے سے الگ اور منفرد بھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اچھے بُرے فیصلے اپنی فہم و فراست کے تحت کرتا ہے۔ چاہے وہ فیصلہ گاؤں سے باہر جانے کا ہو یا جنگ میں شامل ہونے کا۔ وہ کسی کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ صرف اپنے من میں جھانک کر نئی دنیا تلاش کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اسی قوت کو وجودی آزادی کا نام دیا ہے۔ اس ناول کی مزید تفہیم کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "عبداللہ حسین نے بیسویں صدی سے 1947ء تک نصف صدی کے تاریخ ساز واقعات کی تعبیر کرتے ہوئے کسی نظریاتی جھکاؤ یا التباسی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ اس کے یہاں ناول کا بہاؤ دریا کے بہاؤ کی طرح ہے۔ ناول کا واقعاتی بیانیہ کسی تھیوری یا فلسفے کا پابند نہیں۔ اس پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ سامراج اور نوآبادیاتی باشندوں کے مابین بنتی ہوئی نئی طبقاتی درجہ بندی کا ادراک نہیں کر سکا۔ میرے خیال میں عبداللہ حسین اگر اس ادراک سے محروم رہا تو اچھا ہی ہوا ہے۔ یہی چیز اس کے بیانیے کا امتیازی وصف ہے۔ اگر وہ طبقاتی درجہ بندی کا ادراک کر لیتا تو وہ بھی خواجہ احمد عباس اور ابراہیم جلیس کی طرح تعصب کی عینک سے دنیا کو دیکھنے لگتا۔ یوں اس کا ناول، ناول نہ رہتا، فکشن کی زبان میں لکھی ہوئی ایک سیاسی دستاویز بن جاتا"۔(5)

ڈاکٹر آفاقی کی یہ بھرپور کوشش رہی کہ وہ "اداس نسلیں" میں شامل تمام موضوعات کو ناول کے مرکزی کردار نعیم کی زبانی سامنے لائیں، اپنی اس ادبی مساعی میں وہ پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ اس تجزیاتی تکنیک نے جہاں نعیم کے کردار کا نفسیاتی اور سماجی مطالعہ پیش کیا وہاں ناول کا موضوع اپنی کامل جزئیات سمیت منکشف ہوا ہے۔ اس ناول میں نوآبادیاتی تناظرات کا سلسلہ بھی خاصا دراز ہے جسے خاصے ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ بار بار اُجاگر کرنے کی سعی ملتی ہے۔ ڈاکٹر

اقبال آفاقی کا تجزیہ ہر اعتبار سے بڑا بھرپور اور جامع ہے جس میں ناول کے ایسے چھپے گوشے بھی سامنے آنے لگتے ہیں جنھیں نقاد بالعموم نظر انداز کر جاتے ہیں۔ تخلیقی متن کو اس سطح پر زیر بحث لانا ہماری تنقید میں کم کم دیکھنے میں آیا ہے۔

اگلا ناول بستی تاریخ سے بھاگے ہوئے آدمی کی روداد ہے۔ انتظار حسین اردو زبان و ادب کے اہم فکشن نگار ہیں۔ ان کی ادبی زندگی مختلف جہات میں پھیلی نظر آتی ہے، وہ بطور افسانہ نگار، ناول نویس، مترجم، ڈرامہ نگار، نقاد، تذکرہ نگار، سوانح نویس، سفر نامہ نگار، صحافی، مدون، مدیر شہرت کے حامل ہیں اور بچوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ان کے ناول "بستی" کو ناول نگاری کی روایت میں اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس ناول کو گیارہ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو آپس میں موضوعی تنوع رکھنے کے باوجود منطقی اعتبار سے باہم مربوط ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اس ناول میں علامت، تجرید اور کہانی پن کا بالخصوص ذکر کیا ہے اور اس ناول کا باقاعدہ تجزیہ کرنے سے پہلے اپنے اولین تاثرات کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ادب اور عالمی ادب کا وہ وسیع پس منظر یا تناظر بھی سامنے لایا گیا ہے جس کی روشنی میں "بستی" کی معنویت زیادہ بہتر طور پر منکشف ہوتی ہے۔ انتظار حسین کی فکری جمالیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال آفاقی نے ہمارے ہاتھ ایک ایسی کلید تھمادی ہے جس کی روشنی میں ہم "بستی" کا مطالعہ درست سمت میں کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ انتظار حسین ہند آریائی قوت کے آواگونی تصور کا قائل ہے۔ یاد رہے کہ نطشے بھی وقت کی ایسی ہی تشریح کا قائل تھا۔ انتظار حسین کے پاس کھل جا سم سم کا وہ مسرت موجود ہے، جو ماضی کے بند دروازوں کو وا کر دیتا ہے۔ وہ شعور کی رو پر چلتے ہوئے صدیوں پرانے قریوں، بستیوں اور دیار نینوا کے بے آب و گیاہ میدانوں میں جانکلتا ہے۔ گزرا ہوا وقت الف لیلی کے اس بوڑھے آدمی کی طرح ہے، جو کسی غار میں صدیوں سے بیٹھا ہوا اس کا انتظار کر رہا ہے"۔(6)

ڈاکٹر آفاقی نے "بستی" کی تفہیم میں حائل ایسی تمام رکاوٹوں کو بھی دور کیا ہے جس کی طرف پہلے ناقدین کا دھیان نہیں جاسکا تھا۔ "بستی" کا ادبی زمانہ وہی ہے جب فضاؤں میں وجودیت اور علامت نگاری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ من مانے ادبی پیمانے اپنی جگہ بنا چکے تھے اور لایعنیت کا جادو بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اُردو میں انیس ناگی اور انور سجاد بھی مغربی اثرات کے تحت اپنا راستہ نکالنے کی فکر میں تھے۔ یہ وہی دور ہے جب انور سجاد نے "خوشیوں کا باغ" لکھا اور انیس ناگی نے "دیوار کے پیچھے"۔ یہ دونوں ناول اپنے عہد کے غالب ادبی اور سماجی رجحانات کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ یہ کہنا شاید مناسب ہو گا کہ اب اتنا وقت گزر جانے کے بعد یہ دونوں ناول محض ادبی تاریخ کا حصّہ ہیں اور موجودہ دور میں ان کا قاری تلاش کرنا محال ہے۔ اس کے مقابلے میں "بستی" کا قاری آج بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بہتر انداز میں سوچ بھی سکتا ہے۔

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 05، شمارہ نمبر 01، جون-2024

"بستی" کی کہانی اوراس میں شامل تہذیبی وثقافتی منظرنامہ قاری کو اسی جانی پہچانی فضا میں باندھ کر رکھتا ہے جس سے باہر نکلنا بظاہر ناممکن لگتا ہے۔ عبد اللہ حسین نے کہانی کو روایتی تکنیک سے باہر رکھا لیکن ناول کی موضوعی سطح کو "ثقافتی اور معتقداتی نظام" کے اندر ہی رکھا جس کی وجہ سے یہ ناول اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ یہ ناول معاشرتی حقائق اور زندہ سماج کی آرزوؤں اور اندیشوں کا عکاس ہے۔ طبقاتی سماج کے مسائل اور مصنوعی قدروں کا نباض اور نقاد بھی ہے۔

پانچواں ناول راجہ گدھ۔۔۔۔ عشق لا حاصل سے مقدس دیوانگی تک ہے۔ڈاکٹر اقبال آفاقی نے آج تک فکشن کے حوالے سے جتنے تجزیات بھی پیش کیے ہیں اُن میں وہ ہر ناول پر ایک مختلف طریق کار کے تحت طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کا ہر ادبی مقالہ مکمل طور پر دوسرے سے الگ اور منفرد ہوتا ہے۔ "راجہ گدھ" پر ان کے مقالے کا آغاز ہی ناول کا جامع تعارف کرانے کے لیے کافی ہے:

> "بانو قدسیہ کا یہ ناول جدیدیت کی چھتر چھاؤں میں بیٹھ کر لکھا ہوا جدیدیت کا انتقاد ہے۔ اس کی زبان اوراُسلوب میں اپنی طرف کھینچنے والی مقناطیسیت موجود ہے۔ اس میں وہ حقیقت نگاری وتجربات موجود ہیں، جو مشاہدات وشواہد پر مرکوز ہوتے ہیں، جس کی پشت پناہی نفسیات اور عمرانیات کے اُصول کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے بڑی محنت اور تجسس سے کام لے کر جدید زندگی کی معنیات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اسے ایک مقصدی تعبیر فراہم کی ہے۔ اس کو ہم زندگی کی اس مابعد النفسی اور صوفیانہ تعبیر کا تسلسل قرار دے سکتے ہیں، جس نے اسلامی کلچر اور تمدن کو نہ صرف متمول کیا تھا بلکہ اسلام کی جغرافیائی حدود میں انسانوں کو باہم جوڑنے اور متحد رکھنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا تھا"۔(7)

ڈاکٹر آفاقی کا انداز نگارش مجھے ہمیشہ فرانسس بیکن کی یاد دلاتا ہے وہ بھی کم سے کم الفاظ میں فکرو نظر کا ایک جہانِ معنی کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اختصار اور نثری بلاغت ان دونوں کے ہاں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ایک پیرا گراف میں چھپے مفاہیم کو اگر الگ الگ عنوانات کے تحت دیکھا جائے تو یہاں ہمیں جدیدیت کے پیدا شدہ عوارض کا رد بھی نظر آئے گا (بہ حوالہ بانو قدسیہ)، ایسی سماجی بصیرت کا احوال بھی کھلتا ہے جس کا تعلق ہمارے روزمرہ مشاہدات کے ساتھ ہے لیکن ہم ان کے کذب وصداقت کو کسی معروضی اُصول کے تحت زیر بحث نہیں لا سکتے البتہ ان کی عمومی صورتوں کو کسی حد تک نفسیات اور سوشیالوجی میں دیکھا پرکھا جا سکتا ہے۔ بانو قدسیہ کا world View بڑی حد تک اخلاقی اور مقصدی ہے جس کی طرف ڈاکٹر اقبال آفاقی نے بڑے بلیغ اشارے کیے ہیں۔ اس ناول میں متصوفانہ روایت کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے جس نے مسلم فکریات کو اپنا اسیر بنائے رکھا ہے۔ تاہم یہ اس ناول کا ایک پہلو ہے اگرچہ اس کا خاصا پھیلاؤ بھی ہے۔

پاک وہند میں "راجہ گدھ" کی فکریات اور فنی پہلوؤں پر کافی کچھ لکھا گیا ہے لیکن زیادہ تر تنقیدی سرمایہ یک طرفہ ہے۔ یعنی اس میں ناول کی محض مابعد الطبیعیاتی کہانی پر فوکس کیا گیا اور حرام وحلال کے غیر سائنسی تصورات کو سراہا گیا۔ ناول کے کمزور فنی پہلوؤں اور کہانی کی دھندلاہٹ پر کھل کر کسی نے بات نہیں کی، یہ اہم فریضہ ڈاکٹر اقبال آفاقی ادبی دیانت اور عالمانہ وسعت کے ساتھ سامنے لائے ہیں۔ ماضی میں البتہ اسی قسم کی ایک کوشش وارث علوی نے کی تھی جس میں "راجہ گدھ" کے اضافی مقامات اور کہانی پن کے جھول اور دیگر فنی وفکری سقم کو موضوع بنایا تھا۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اس ناول پر جس انداز سے قلم اٹھایا اس میں ہمارے جدید نقادوں کی تفہیم وتربیت کے لیے بڑے واضح اشارے موجود ہیں۔ ڈاکٹر آفاقی کا بنیادی موقف یہ ہے کہ فکشن کا فریضہ کہانی بیان کرنا ہے، سند مہیا کرنا نہیں۔

اگلا ناول " بہاؤ"۔۔۔ ایک تجزیاتی قرأت ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "بہاؤ" اپنی کہانی، اسلوب، موضوع، کردار نگاری اور بناؤ سنگھاؤ کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے اس ناول کی کہانی اور پس منظر کو بہت عمدگی سے متعارف کرایا ہے۔ قدیم تہذیب کی اس کہانی کا پس منظر اور پیش منظر تبھی سمجھ میں آسکتا تھا کہ اس ناول کے تاریخی تناظرات کو پہلے سامنے لایا جائے۔ یہ فریضہ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے حد درجہ عمدگی سے نبھایا ہے۔ ایک سنجیدہ نقاد کی اولین ذمہ داری یہ بھی بنتی ہے کہ وہ کسی مشکل اور پیچیدہ فن پارے کی تفہیم میں موجود مشکل مقامات کی پہلے اچھی طرح سے وضاحت کرے تاکہ تنقیدی مسائل کا ادراک ہوتا چلا جائے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی اپنے تنقیدی منصب سے کبھی غافل نہیں رہتے۔ "بہاؤ" کے تشکیلی اور تعمیری پہلوؤں پر اس انداز سے پہلے کسی اور نقاد نے شاید ہی لکھا ہو۔ اس ناول کا ابتدائی تعارف بذات خود اتنا جامع ومانع ہے کہ قاری کو ایک ہی جگہ پر اچھے خاصے تنقیدی نکات مل جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی لکھتے ہیں:

> "بہاؤ مستنصر حسین تارڑ کے دوسرے ناولوں سے الگ تھلگ ہے۔ اس میں رومان کی چاشنی ہے نہ ہی لوکیل کی جاذبیت کا سحر۔ اس میں نہ سرخ وسپید حسینائیں ہیں نہ ماڈرنٹی کی چمک دمک اور نہ ہی رومان کے دھنک رنگ۔ عشق پیشہ اور مہم جو مرد بھی ناموجود ہے، جسے عرف عام میں کہانی کا ہیرو کہا جاتا ہے۔ اسلوب میں گنگا جمنی پوترتا اور قلعہ معلیٰ کا شکوہ بھی غیر مفقود ہے، جو ویسے ہی ترفع کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔ ناول کا منظر نامہ دریا کنارے کی قدیم دیہاتی زندگی کے مظاہر سے متشکل ہوا ہے۔ اس کا لسانی ڈھانچہ پنجابی، سرائیکی، سندھی اور دراوڑی زبانوں کے ورتارے سے قدرے نامانوسیت کی فضا بناتا ہے۔ ناول کے کردار بھی سنسنی خیز نہیں"۔(8)

یہ مستنصر حسین تارڑ کا بڑا اور نمائندہ ناول ہے جسے لکھنے میں انھوں نے تقریباً بارہ سال لگادیے۔ ناول کی تیاری کے دوران اس کا کچھ بنیادی مواد علی عباس جلال پوری اور عین الحق فرید کوٹی نے فراہم کیا تھا جس کا ذکر مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا تھا۔ اُن کا کہنا تھا:

"گلاسری علی عباس جلالپوری نے بنا کر دی، کیونکہ لوگ کہتے کہ بہاؤ میں پنجابی بہت ہے، لیکن بیشتر جو پنجابی ہے وہ دراوڑی کے حوالے سے ہے۔ شاہ صاحب نے ان لفظوں کی گلاسری اس لیے بنا کر دی کہ ان کا ماخذ دراوڑی زبان سے ہے"۔(9)

اس ناول میں ایک معدوم اور فنا شدہ تہذیب کو تخیل اور فن کے زور پر از سر نو زندہ دکھایا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبال آفاقی یہ ناول فلم کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار پاروشنی ہے۔ اس کے علاوہ چیوا، ماتی، سمرو، ورچن، مامن ماسا، پکلی، مندرا، ماتی، کومی، گجرو، دھروا، جبو، سکھی، بوٹا، جھوریا وغیرہ شامل ہیں۔ ناول میں جس بستی کا ذکر آیا ہے وہاں کسی قسم کا کوئی عبادت خانہ بھی نہیں ہے البتہ اشیا کی پرستش کا عام رجحان نظر آتا ہے۔ یہاں ہمارے سامنے کچھ ایسے مقامات بھی آتے ہیں جن سے ہم پہلے کبھی مانوس نہیں رہے۔ ان میں امن ماسا، سرسوتی، گھاگرا، پکلی، سمرو جیسے نام شامل ہیں۔ ناول میں سامنے آنے والے کردار بھی ہماری روزمرہ زندگی سے بالکل برعکس ہیں۔ قاری اس نئی اور اجنبی فضا میں آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کی ہر ممکن کوشش یہی رہی ہے کہ وہ اس مشکل اور پیچیدہ ناول کی کہانی اور پلاٹ کے لوازم کو آسان پیرائے میں واضح بھی کرتے جائیں تاکہ ایک عام قاری بھی اس ناول کے فنی اور فکری اجزائے ترکیبی سے واقف ہوتا چلا جائے اور بلاخوفِ تردید وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب رہے ہیں۔

یہ ناول ایک قدیم تہذیب کو متحرک دکھانے کے لیے جس انداز سے کرداروں کو زندہ کرتا ہے وہ بجائے خود قابل تعریف عمل ہے۔ اس کرداری کی طرف ڈاکٹر اقبال آفاقی نے بھی بار بار ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ ناول "بہاؤ" کے کرداروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تمام کردار متحرک، زندگی کے رچاؤ سے مالا مال، جان دار، تیکھے، جہاں دیدہ کیفیات سے بھرے ہوئے اور اپنے خاص پیشوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہاں ایسا کوئی کردار نہیں جسے ہم بھرتی کا کردار یا اضافی یا فالتو کردار کہہ سکیں۔ تارڑ نے ناول "بہاؤ" کے مختصر کرداروں کے ذریعے ایک پوری تہذیب کو زندہ کر دکھایا ہے۔

اس کے بعد "غلام باغ"، روایت سے ہٹا ہوا ناول ہے۔ مرزا اطہر بیگ 17 مارچ 1950ء کو شیخوپورہ کے قصبے شرق پور میں پیدا ہوئے۔ فلسفے کی درس و تدریس سے منسلک رہے۔ فکشن اور ڈرامہ نگاری کے حوالے سے اُن کی شہرت مسلمہ ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے کئی مقبول ڈرامے لکھے جن میں "دلدل"، "پاتال"، "نشیب" اور "حصار" زیادہ اہم ہیں۔ فکشن کی دنیا میں "غلام باغ" ان کا پہلا ناول ہے۔ اس کے بعد "صفر سے ایک تک"، "حسن کی صورت حال" اور "خالی جگہ پر

کرو" سامنے آئے۔ افسانوں کا مجموعہ "بے افسانہ "1914ء میں شائع ہوا۔ شہرت، موضوع، تکنیک اور برتاؤ کے اعتبار سے "غلام باغ" کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔

اس کی نئی اور نادر تکنیک کے بارے میں ڈاکٹر اقبال آفاقی نے لکھا ہے کہ "اپنے مقام میں اردو ناول کی روایت سے ہٹ کے واقع ہے۔ بلکہ انگریزی ناول میں بھی یہ تکنیک ناپید ہے۔ اس کے ڈانڈے یورپی ناول خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں"۔ اس کے علاوہ بھی فاضل نقاد نے اس ناول کی بنت کے بارے میں کچھ اہم پہلوؤں کو نشان زد کیا ہے مثلاً اس کا پلاٹ روایتی پلاٹ سے الگ ہے، ناول کی مجموعی سکیم عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ہے، "بیانیہ بھی اردو کی افسانوی روایت سے منحرف نظر آتا ہے، اس کے موضوعات میں انسان کے بڑے بڑے فطری جذبات واحساسات، نفس پرستی، محبت، انتقام اور روز مرہ کے تنازعات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مزید یہ بھی لکھا:

> "اطہر بیگ نے تخلیقی فعلیت کو سرد مہری کی حد تک ناول کے کھیل تک محدود رکھا ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے بعض تکلیف دہ مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ شاید قاری کے فہم کی جان بوجھ کر تضحیک کی جارہی ہے۔ لگتا ہے اس کے متن کی جمالیات پر دریدا کی روتشکیلات کا کڑا پہرہ ہے۔ حد یہ کہ بعض مقامات پر جذبے اور آدرش سانس لینے سے بھی معذور نظر آتے ہیں۔ التوامیں پڑتے لامعنی سلسلوں کے ناول حمام باد گرد کی صورت اختیار لیتا ہے، جس کی خبر لانا ناممکن کو ممکن بنانا ہے"۔(10)

ڈاکٹر اقبال آفاقی کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ ناول کے موضوعاتی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ سامنے لائیں تاکہ ان کا قاری ناول کی فکری اور فنی جمالیات سے براہ راست آگاہی حاصل کر سکے۔ زیرِ نظر ناول پر بھی اس طریق تنقید کے تحت اس کے جملہ موضوعات کی طرف بڑے بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ فن کے حوالے سے یہ بات بھی بتائی گئی کہ اسے کسی خاص صنف یا Genre سے جوڑا نہیں جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ناول کو روایتی حد بندیوں سے الگ رکھا گیا ہے۔ "اس میں ناول کی مختلف حدود کی شکست وریخت کا ایک پیٹرن اُبھرتا نظر آتا ہے، اس میں ناول کی مختلف اقسام باہم مدغم ہوئی ہیں۔ اس ادغام کو مجمع بحرین کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، جس نے ناول کا کینوس بہت وسیع کر دیا ہے۔ "یعنی اس ناول کو ہم عمومی تناظر میں نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کی بہتر تفہیم کی خاطر ناول نگار کی فراہم کردہ حدود وقیود کی پاس داری کرنا پہلی شرط ہے۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی اس ناول کی جن مختلف سطحوں کو نمایاں کرتے ہیں ان میں چندر گپت موریہ کا جنم کھنڈر اور اس سے ملحقہ باغ، ارزل نسلوں کا اساطیری بیانیہ، مانگر قوم کے ساتھ ہونے والے سماجی مظالم ذات پات کی تقسیم، طبقہ امراء کی جنسی بھوک اور مذموم عزائم، یاور عطائی کی کرداریت، ایک نفسیاتی مریضہ جو ڈاکٹر کی ہوس کا نشانہ بنی۔ معاشرے کے قابل

افراد کا استحصال "مابعد نو آبادیاتی نظام کی حرام کاریاں"، سماجی بربریت، ناانصافی، سمگلر امبر جان کے واقعات۔ اسلوب کے حوالے سے ہی یہ بتایا گیا ہے کہ وہ انتہائی غیر ادبی اور بو جھل ہے۔

اگلا ناول "ناتمام" سنسار چکر میں پڑی ہوئی نئی سیتا کی کہانی ہے۔ محمد عاصم بٹ اردو زبان وادب کے بہترین مترجم، مدیر اور کالم نگاری کے حوالے سے معروف ہیں۔ ان کے تراجم ادب کے علاوہ دیگر سماجی موضوعات کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں "مجید"، "ناتمام" اور "دائرہ" کا خصوصی حوالہ شامل ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے ان کے ناول "ناتمام" کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ اپنے مخصوص طریقے کے مطابق ڈاکٹر اقبال آفاقی نے سب سے پہلے اس ناول کے مرکزی کرداروں کو واضح کیا ہے جس کی وجہ سے ناول کی تقسیم اور اس پر ہونے والی تنقید کا تمام تر پیٹرن اپنی کامل معنویت کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ ابتدا میں وہ کچھ سوالات اٹھانے سے پہلے یہ نکتہ قاری کو بتاتے ہیں کہ "ناتمام" کی کہانی بہت عام بلکہ پیش پا افتادہ ہے۔ سوالات کی نوعیت یہ بنتی ہے کہ کیا کہانی کی عمومیت کو دیکھتے ہوئے اس پر تنقید لکھنے سے گریز کیا جائے یا ناول کے اس طلسم کو دریافت کیا جائے جو اس کہانی میں پوشیدہ ہے، بلکہ "یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا مصنف اس گھاؤ تک پہنچنے میں کامیاب رہا ہے جو اس Primordial کے قلب میں پنہاں ہے یا مصنف نے محض کرافٹ سے کام لے کر ایک بنی بنائی کہانی کو ناول کے قالب میں ڈھال دیا۔ کہانی میں تخلیقی جوہر اور وجودیاتی اہمیت کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ تنقید میں اس طرز کا بیان ذرا کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی کسی فن پارے پر لکھتے وقت اس کے بارے میں ایسے سوالات بھی قائم کرتے ہیں جس سے بظاہر فن پارے کی نفی ہوتی محسوس ہوتی ہے لیکن در حقیقت وہ ابتدا ہی میں اپنا مقدمہ ایسا مضبوط بنا لیتے ہیں جس کی بنیاد پر فن پارے کی ممکنہ جہتیں سامنے آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس خوبی نے ڈاکٹر اقبال آفاقی کی تنقید میں نہ صرف وسعت پیدا کی ہے بلکہ اکثر مقامات پر تنقیدی معروفیت بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے جس کی روشنی میں فن پارہ اپنی گرہیں کھولتا چلا جاتا ہے۔

"ناتمام" اصل میں تین عورتوں کی کہانی پر مشتمل ہے جس میں مرکزی کردار صائمہ کا ہے۔ یہ کردار ایک ایسے الم ناک ماحول سے نکل کر ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے جہاں وجود کو قائم رکھنے کے تمام اسباب ناپید تھے۔ قاری اس کردار کے حوالے سے دنیا کو دیکھتا پرکھتا ہے۔ اس کردار نے دنیا کا وہ گھناونا چہرہ بھی دکھایا ہے جو بالعموم ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ جس ناول نگار کے حوالے سے اپنے تنقیدی مقالے کا عنوان تجویز کرتے ہیں وہ اس عنوان کو اپنے مقالے کے مختلف مقامات پر واضح بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا ایک تنقیدی نظام یا ڈسپلن ان کی ہر تحریر کا ایک ایسا خاصہ ہے جسے کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیرِ نظر مقالے میں بھی انھوں نے ناول کے

مرکزی کردار صائمہ کے لیے "نئی سیتا" کی علامت متعارف کرائی ہے۔ انھوں نے کمال مہارت سے اوّل تا آخر عمدگی سے اسے نبھایا ہے۔ ایک جگہ وہ ان دونوں کرداروں کی باہمی مماثلت و مشابہت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ناتمام" میں سیتا نے صائمہ کے روپ میں جنم لیا ہے، فرق یہ ہے کہ سیتا کی چتاؤں کے قصّے کو راج دربار کی تجلیل حاصل تھی لیکن یہاں صائمہ کو زمانے نے ملامت اور دھتکار کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اسے تاریک راہوں کے سوا کچھ نہیں ملا، حالانکہ اس کی آتما سیتا کی طرح پوتر اور پاک تھی لیکن وہ بھی کرموں کی ماری ہوئی اور قسمت کی ہاری ہوئی ہے۔ گویا موضوع وہی ہے، سماج کی اتیاچاری،، مرد کی اہنکاری اور ناری جات کی لاچاری صائمہ نے بھی سماج کی بھکشا لینے سے انکار کر دیا"۔(11)

ڈاکٹر اقبال آفاقی کے ہاں ناول کا تصور بھی آفاقی ہے وہ ناول کو روایتی یا کلاسکی پیمانوں میں رکھ کر نہیں پرکھتے، ان کے ہاں ناول کا تصور ای ایم فاسٹر کے میکانکی تصور جیسا نہیں ہے جس میں سارا زور یہ دیکھنے میں صرف کیا جاتا ہے کہ ناول میں مکالمہ نگاری، پلاٹ، کہانی اور مجموعی فضا کیا تاثر پیدا کرتی ہے بلکہ وہ ناول کو زندگی اور سماج کا بہترین عکاس سمجھتے ہیں جس میں انسان سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کسی نہ کسی صورت میں اپنی جھلک دکھاتے چلے جاتے ہیں۔

آخری ناول "جاگے ہیں خواب میں"، ایک متنی تجزیہ ہے۔ اختر رضا سلیمی کی ادبی مصروفیات میں شاعری، تنقید، ناول نگاری اور ان کے متعلقات شامل ہیں جس کی فہرست بندی میں کئی ذیلی موضوعات کا ذکر آسکتا ہے۔ یہ کہنے میں بالکل کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ بحیثیت شاعر اور ناول نگار انھوں نے ایک جیسی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کا پہلا ناول "جاگے ہیں خواب میں" اور دوسرا ناول "جندر" کے نام سے سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے زیرِ نظر مقالے میں "جاگے ہیں خواب میں" کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس ناول پر بات کرنے سے پہلے انھوں نے چند اہم نکات کی جانب ہماری توجہ دلائی ہے:

> "اختر رضا سلیمی کے ناول "جاگے ہیں خواب میں" کو پڑھتے ہوئے قاری ایک حیرت کدے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ حیرت کدہ ہمیں طبیعیات کے دائرے سے نکال کر مابعد الطبیعیات کے دائرے میں منتقل کر دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا کا دروازہ منکشف ہوتا ہے جس میں داخل ہوتے ہی قاری شعور، لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے حوالے سے سامنے آنے والی گرہوں کو سلجھانے میں لگ جاتا ہے۔ سوچنے لگتا ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے۔ ناول کے مختلف مراحل میں بہت سے سوال پیش رفت کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا کائنات سے پرے بھی کوئی کائنات ہے؟ مادے اور خلا کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا اندھیرا اور خلا ایک

ہی تصویر کے دورخ ہیں؟ کیا وجود کا غبارہ پھٹ جائے تو ازل سے ابد تک ہر چیز آئینہ ہو سکتی ہے؟ کیا علت و معلول کے رشتے حقیقی ہیں یا ان کی وجہ انسانی فہم کی محدودیت ہے؟ کیا خواب اور حقیقت ایک ہو سکتے ہیں"؟(12)

یہ سوالات قائم کرنے کے لیے جہاں ناول کے جدید تصورات اور فنی رموز کا حافظے میں محفوظ ہونا ضروری ہے وہاں ناول کا ارتقائی سفر بھی سامنے رکھنا لازمی ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی ایک وسیع المطالعہ نقاد اور محقق ہیں وہ کسی بھی ناول کا تجزیہ کرنے سے پہلے متعلقہ ناول کو بہت توجہ اور عمیق باریک بینی سے پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مرتب کردہ نتائج بہت گہرے اور عمیق ہوتے ہیں۔ اختر رضا سلیمی کا ناول اگرچہ کچھ بہت زیادہ ضخیم نہیں ہے کہ جس میں حیات وکائنات کے اتنے بسیط موضوعات کو سمویا گیا ہو لیکن انھوں نے جس کمال مہارت، اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایسے گھمبیر موضوعات کو کم صفحات میں سمویا وہ ان کی فنی مہارت، زبان وبیان پر عبور، واضح تصورات اور ورلڈ ویو کا پتا دیتے ہیں۔ اس ناول میں تکنیک کے حوالے سے بھی نئے نئے تجربات ملتے ہیں جو عموماً ہمیں اردو ناولوں میں کم کم نظر آتے ہیں۔ وقت کا تصور بھی ایک نئے تجربے کا اشاریہ فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے ناول کی فکریات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

Research Journal
Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر05، شمارہ نمبر01، جون-2024

حوالہ جات

1۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، انٹرویو، مقالہ نگار، ڈاکٹر شیر علی، رہائش گاہ، اسلام آباد، 26۔ اپریل2024ء، سہ پہر 3 بجے

2۔ ڈاکٹر محمد افضل بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، 2009ء، ص9

3۔ ممتاز مفتی، علی پور کا ایلی، وجودی بحران میں لکھا ہوا ناول، ص38

4۔ عبداللہ حسین، اداس نسلیں کا مرکزی کردار نعیم، معنیات کے تناظر میں، ص62،

5۔ ایضاً، ص63

6۔ انتظار حسین، بستی تاریخ سے بھاگے ہوئے آدمی کی روداد، مشمولہ، اُردو ناول: نئی توجہیات و تعبیرات، ص90

7۔ بانو قدسیہ "راجہ گدھ"، عشق لاحاصل سے مقدس دیوانگی تک، مشمولہ، اردو ناول: نئی توجہیات و تعبیرات، ص 116

8۔ "بہاؤ" ایک تجزیاتی قرات، مشمولہ اردو ناول: نئی توجہیات و تعبیرات، ص139

9۔ سہ ماہی "استعارہ": مستنصر حسین تارڑ سے ایک ملاقات، شمارہ اپریل2018 تا جون2018، پینل، ص24

10۔ "غلام باغ" روایت سے ہٹا ہوا ناول، مشمولہ، اردو ناول: نئی توجہیات و تعبیرات، ص164

11۔ "ناتمام" منار چکر میں پوری ہوئی نئی سیتا کی کہانی، مشمولہ، اُردو ناول: نئی توجیہات و تعبیرات، ص199

12۔ "جاگے ہیں خواب میں"، ایک متنی تجزیہ، مشمولہ، اُردو ناول: نئی توجیہات و تعبیرات، ص215

☆☆☆